پروفیسر محمد حسین آزاد اور "نیرنگِ خیال"

از

(جناب لکشمی نرائن وششٹ صاحب تابش ایم۔ اے)

یوں تو پروفیسر آزاد نے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن 'آبِ حیات' کے بعد اگر کوئی تصنیف انھیں زندۂ جاوید مصنفین کی فہرست میں جگہ دلا سکتی ہے۔ تو وہ ان کی "نیرنگ خیال" ہے ہم صرف اس کی بنا پر ہی آزاد کو اردوئے معلٰی کا ہیرو قرار دے سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ کتاب سراپا ان کے خاص رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ اس میں وہ خصوصیات پائی جاتی ہیں جو انھیں ادب اردو میں غیر فانی رتبہ دلاتی ہیں۔ آزاد نے اس میں استعارات اور تشبیہات کا دریا بہا دیا ہے۔ خیالات کو مطالب پر اس قدر وسعت دینا کہ نثر کی تخیل پردازی شاعرانہ خیال آرائی اور ادبی گل کاری کی حد کو ٹکرائے آزاد کا طغرائے امتیاز و افتخار ہے۔ آزاد نے اردو کی جو خدمت کی ہے۔ وہ سب پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ اور اس خدمتِ بیش بہا سے اردو کا سر جھکا ہوا ہے۔ زبان کا چٹخارہ۔ صفائی۔ پاکیزگی شگفتگی اور مضامین کی سادگی اور رعنائی اس کتابِ لازوال کے خاص جوہر ہیں۔ آزاد کی زبان میں وہ لوچ۔ لطافت دلفریبی اور دلآویزی ہے۔ جو پنڈت رتن ناتھ سرشار کے سوا اردو ادب کے کسی دوسرے لکھنے والے کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ ان دونوں شہسواروں نے میدانِ اردو میں سرپٹ گھوڑے دوڑائے ہیں۔ اس کی عظمت و شہرت میں چار چاند لگائے ہیں۔ اردو زبان کو دوسری زبانوں کے دوش بدوش لا کھڑا کیا ہے۔ اور اس کو وسعت بخشی ہے۔

آزاد اس دور کی پیداوار ہیں۔ جب کہ ہندوستان میں زبردست تبدیلی ہو رہی تھی مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ اور وہ بجھا چاہتا تھا۔ غدر ہوا اور اس سے لوگوں پر جو

مصائب و آلام پڑے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، غدر ایک سیاسی اہمیت ہی نہیں رکھتا بلکہ ادبی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اگرچہ یہ زمانہ ایک عجیب افراتفری، کشمکش، ہنگامہ آرائی۔ تذبذب ذہنی الجھن اور انتشار کا تھا۔ لیکن اس کے بعد سے ہی نثری ماحول پیدا ہوا۔ سر سید اور ان کے ساتھیوں کی تحریک چلی۔ اور ادھر بنگال میں راجہ رام موہن رائے کی تحریک وجود میں آئی۔ لوگوں کو نئے حالات، نئے واقعات اور نئی زندگی کی کشمکشوں سے سابقہ پڑا۔ اس لئے اس زمانہ میں نئے حالات، واقعات اور زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرنا ایک عام خیال ہو گیا تھا۔ جدید شعر و شاعری کی بنیاد اسی زمانہ میں پڑی۔ اس میں بھی ایک جدت طرازی برتی گئی، نئے نئے موضوعات پر طبع آزمائی ہونے لگی۔ اور نثر بھی نئے سانچے میں ڈھلنے لگی۔ یہ چیزیں اردو ادب میں بالکل نئی تھیں۔ جن سے اردو ادب ابھی تک محروم تھا۔ لیکن اگر ہم اس سے پہلے دور کا تجزیہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا۔ کہ اس زمانہ میں زیادہ تر مافوق الفطرت قصے یا مذہبی کتابیں لکھنے کا عام دستور تھا۔ جو اکثر مسجّع اور مقفّٰے عبارت میں لکھی جایا کرتی تھیں۔ آزاد نے پرانی چیزوں کو پس منظر بنا کر نئے رستے نکالے ہیں۔ اور اردو ادب کی کمی کو پورا کر دکھایا ہے۔

آزاد نے مختلف کرداروں کو سامنے رکھ کر زندگی کی صحیح عکاسی اور ترجمانی کی ہے۔ داروغۂ دانش، غفلت، سلطان افلاک، غرور، کاہلی، خوشامد، ملک الکلام، داروغہ خیال وقت، غصہ، عشق، افواہ یا شہرت، حسن کی پری، خسرو آرام، تحمل، عیش، نشاط، ملکہ صداقت زمانی اور دروغ دیوزاد وغیرہ ایسے کردار ہیں۔ جو مختلف خوبیوں اور کمزوریوں کے حامل ہیں اور جن سے زندگی کی سچی اور ابدی قدروں کا پتہ چلتا ہے۔ کرداروں کی کامیابی نے زندگی کے سین اور منظر کے اندر لہر دوڑا دی ہے۔ جس کو پڑھ کر ہم سوچنے لگتے ہیں۔ یہ زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ جن میں بناوٹ کی تو او ربو نام کو بھی نہیں ہے ان سے ہر صاحب ذوق لطف اندوز ہوتا ہے اور اس کے علاوہ ہر پڑھنے والے کو ان سے اخلاقی درس بھی ملتا ہے انھوں نے زندگی کے شدید عکس اور روپ کہانیوں کی شکل میں بتاتے ہیں۔ زندگی کیا ہے

اور انسان کا نظریۂ زندگی کیا ہے۔ اور کیا ہونا چاہئے۔ انسان اپنی زندگی کیسے بسر کرتا ہے۔ ارمان اور خواہشات میں کیسے کامیابی اور ناکامی ہوتی ہے۔ انسان شہرت کا کیوں طالب ہے اور اس کے راستے میں مشکلات کیوں اور کیسے حائل ہوتی ہیں۔ یہ تمام احساسات زندگی کی بعض بنیادوں کی طرف ہماری توجہ مبذول کرتے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زندگی عمل کی طرف گامزن ہے۔ اس میں نئی جان۔ نئے ولولے، نئے ارمان، نیا حوصلہ، نئی ہمت نئی تیزی اور نئی کاوش گھومتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ آزاد کے یہاں زندگی کا ایک ترقی پسندانہ نقطۂ نظر ملتا ہے۔ اور زندگی میں فرض کی تکمیل بھی پائی جاتی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہمیں آزاد کا نظریۂ زندگی بھی ترقی پسندانہ ملے گا۔

کہا جاتا ہے کہ کرنل ہالرائیڈ اور ڈاکٹر لائٹنر نے آزاد کو اس کتاب کو لکھنے کی ترغیب دی تھی اور اس کا خاکہ بھی تیار کر کے انھیں دے دیا تھا۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے۔ کہ ان کے بعض مضامین انگریزی نثر نویسوں کے مضمونوں کے ہو بہو ترجمے ہیں۔ لیکن وہ اپنے دیباچہ میں یوں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ "یہ چند مضمون جو لکھے ہیں نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کئے ہیں۔ ہاں جو کچھ کانوں نے سنا اور فکر مناسب نے زبان کے حوالے کیا۔ ہاتھوں نے اسے لکھ دیا" اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے انگریز نثر نویسوں سے کافی استفادہ حاصل کیا ہے لیکن آزاد کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ باوجود انگریزی کم جاننے کے وہ اس میں پورے اترے ہیں۔ انھوں نے ان تمام چیزوں کو ایک نئی زندگی بخش کر اپنی چیز بنا لیا ہے۔ اور حقیقت کا رنگ بھر کر بڑے لطیف انداز میں پیش کیا ہے اور انسان کے اوصاف و خصائل اور اس کے جذبات و خواہشات کو محسوس صورتوں میں بیان کیا ہے۔ جس سے یہ صحیح معنوں میں طبع زاد معلوم ہوتی ہے۔ ان کے انداز بیان نے اس میں بلا کی رعنائی، شگفتگی اور گھلاوٹ پیدا کر دی ہے۔ جس نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کن حالات کے تحت۔ انھوں نے یہ کتاب لکھی۔ اس

سوال کا جواب اس زمانے کے ادبی ماحول پر نظر ڈالنے سے ملے گا۔ یہ دور نئی نئی چیزوں کا دور تھا۔ زندگی پر مغربی رنگ چڑھ رہا تھا۔ ہر چیز انگریزی اثر میں ڈوبتی ہوئی نظر آرہی تھی اس لئے ظاہر ہے کہ ادبی ماحول کا اثر اردو ادب پر بھی پڑا۔ اور اُردو ادب نے انگریزی اُبٹنا لگاکر اپنے چہرے کو سجایا اور اس سے اس کی چمک دمک اور زیادہ بڑھ گئی۔ اور اس طرح اس نے اس کے گیسو کو سنوارنا شروع کیا انگریزی سے اُردو نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس سے لوگوں نے تنقیدی شعور لیا ہے۔ اس انقلابی دور میں آسان اردو لکھنا۔ ادب کو زندگی کا ترجمان بنانا۔ اور زندگی کی حقیقتوں اور رازوں کو منکشف کرنے کی طرف عام رجحان تھا مولانا حالیؔ، نذیر احمد، شبلیؔ اور دوسرے زبردست انشاپرداز انگریزی ادب سے متاثر تھے۔ اگرچہ وہ اپنی تحریروں میں انگریزی کی سی باریکیاں نہ لاسکے لیکن مخصوص اصنافِ ادب کو لانے کا خیال نہ صرف پیدا ہی ہوا بلکہ اردو ادب کو انگریزی ادب کے سانچے میں اچھی طرح ڈھالنے کی مقدور بھر کوشش کی گئی۔

انگریزی میں ایک صنفِ ادب allegory ہے جسے اردو میں تمثیل نگاری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ملٹن کی Paradise Lost، ملا وجہی کی سب رس، ڈانٹے کی Divine comedy، جان بنین کی Pilgrims progress، مولانا رومی کی فارسی مثنوی، سنسکرت کی ہتوا پدیش، ملک محمد جائسی کی پدماوت (جس کا بعد میں انوار سہیلی کے نام سے فارسی میں ترجمہ ہوا) اور عربی کی اخوان الصفا، وغیرہ کتابوں کے نمونے پہلے سے دوسری زبانوں میں موجود تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب "نیرنگِ خیال" میں جادو نگار قلم سے حکمت و اخلاق کی تصویر کشی استعارات و تشبیہات کا رنگ چڑھا کر کی ہے۔ انھوں نے رسوم و اخلاق حسنہ سے بزم اُردو کو آراستہ و پیراستہ کیا ہے۔ ان میں وہ اخلاقی خوبیاں نمایاں ہیں۔ جو ہندوستان والوں کو ہمیشہ سے مرغوب اور عزیز رہی ہیں انسانی زندگی کے جیتے جاگتے مرقع 'نیرنگ خیال' میں بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے

انسانی زندگی کے نشیب و فراز۔ سفید و سیاہ، مسرت و غم، سرد و گرم اور ترقی و تنزل پر تنقیدی نظر ڈالی ہے جس سے انسان اچھی اچھی چیزوں کو بدل و جان پیار کریں۔ نیکی کی طرف مائل ہوں۔ بری چیزوں سے سخت نفرت کریں۔ اور برائی بھلائی میں تمیز کریں۔ اور زندگی کی اونچ نیچ سے بخوبی واقف ہو جائیں۔

نیرنگِ خیال مختلف مضامین کا رنگین گلدستہ ہے۔ جس کے ہر مضمون کی شگفتگی، لطافت، دلکشی، طرزِ دلبری اور شیرینی پر "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است" صادق آتا ہے۔ اس کے بارے میں مؤلف سیر المصنفین، یوں رقم طراز ہیں:۔

"نیرنگ خیال کی نثر ہزار نظموں پر فوقیت رکھتی ہے۔ رنگین بیانی کا ایک دلفریب مرقع ہے اخلاقی اور تمدنی اصلاح کا ایک سچّا کار دستور العمل، پند و نصائح کا ایک دفتر ہے۔ استعارے اور تمثیل میں وہ وہ مطالب کی باتیں بتائی ہیں۔ کہ پڑھنے والا شستہ خیالات سے مالا مال ہو جاتا ہے اس کتاب نے اردو نثر کی نئی طرز قایم کی۔ اگرچہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کتاب میں زیادہ تر انگریزی روش کا پرتو ہے جس میں مضمون نویسی کی جدید طرز کا تجربہ آ تا را ہے۔"

مولانا حالی فرماتے ہیں:۔

"آزاد کے قلم نے پہلے پہل جذباتِ انسانی کی تجسیم و تشخیص کی۔ اور معقولات کی تصویریں محسوسات کی شکلوں میں کھینچی ہیں۔ اور خصائل انسانی کے فطری خواص ایسے موثر اور دلکش پیرایہ میں بیان کئے ہیں۔ جن سے اردو لٹریچر اب تک خالی تھا۔"

انسان کو دنیا میں ترقی و پستی، اونچ نیچ، عزت و ذلت، امیری اور غریبی، خوش قسمتی اور بد نصیبی سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ آدمی کی حالت ہر وقت بدلتی ہے۔ یہ عام بات ہے کہ پرانا نظام ہمیشہ تبدیل ہو جایا کرتا ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو، موت سے انسان کو ہرگز نہیں ڈرنا چاہئے کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ وہ ایک دن ضرور آ رہے گی۔ اس لئے ملکِ عدم کو خوش ہو کر جانا چاہئے۔ خدا نے دنیا میں انسان کے لئے جو طرح طرح کے ساز و سامان

پیدا کئے ہیں۔ ان کے بھی مقاصد و مطالب ہیں۔ یہ فضول اور بے کار پیدا نہیں کئے گئے۔

زندگی روزمرّہ کے مختلف واقعات کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس دنیا میں آئے دن طرح طرح کے واقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں اور انھیں چھوٹے بڑے واقعات سے ہماری زندگی عبادت ہے۔ اور انھیں واقعات سے ہماری زندگی تشکیل پاتی ہے۔ اور یہی واقعات ہمارے جیون کی عمارت بنانے میں مواد کا کام دیتے ہیں اس زندگی میں ہمیں سینکڑوں اونچ پنچ سے گذرنا پڑتا ہے۔ قدم قدم پر ٹھوکریں لگتی ہیں اور اس طرح آہستہ آہستہ تجربہ ہوتا جاتا ہے۔ اور تب کہیں جاکر آخری عمر میں انسان پختہ، باران گرگ دیدہ اور تجربہ کار بنتا ہے۔ چنانچہ آزادؔ نے اپنے مخصوص انداز میں کتنی پرمعنی اور نکتہ رس بات کہی ہے۔ کہ یہ دنیائے رنگ و بو امتحان کی جگہ ہے۔ خدا نے ہم سب کو یہاں امتحان دینے کے لئے بھیجا ہے۔ واقعی اس زندگی کے امتحان میں صرف وہی لوگ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ جو اپنے کاموں کو ذمہ داری اور فرض شناسی کے ساتھ سر انجام دیتے ہیں۔ ہر کاروبار کو ایمانداری، ہمت، انہماک، جوش، لگن اور نیک نیتی سے کرتے ہیں۔ اور اس امتحان میں رکاوٹ ڈالنے والی چیزوں کا اخلاقی جرأت اور استقلال سے مقابلہ کرتے ہیں۔ اور ان کے سامنے سپر نہیں ڈالتے۔

آزادؔ نے "سیرِ زندگی" میں زندگی کی حقیقی باتیں بتائی ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں

"زندگی ایک میلہ ہے اور اس عالم میں جو رنگا رنگ کی حالتیں ہم پر گزرتی ہیں۔ یہی اس کے تماشے ہیں، لڑکپن کے عالم کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھے تو جوان ہوئے۔ اور پختہ سال انسان ہوئے۔ اس سے بڑھ کر بڑھاپا دیکھا اور حق پوچھو تو تمام عمر انسانی کا عطر وہی ہے۔ بہت سے گرم سرد زمانے کے دیکھتا ہے۔ نشیب و فراز عالم کے طے کرتا ہے۔ بچپن سے لے کر ساری جوانی تجربوں میں گذارتا ہے جب گھس پس کر بڈھا ہولیتا ہے تو آدمی بنتا ہے اور اس قابل ہو جاتا ہے کہ جو سنے یا دیکھے اسے سمجھ بھی سکے۔ دنیا مقام امتحان ہے ہم تم یہاں امتحان دینے آئے ہیں۔"

"انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا" بڑا دلکش اور نصیحت آموز مضمون ہے، جس میں اس فلسفے پر بحث کی گئی ہے کہ "اگر تمام اہل دنیا کی مصیبتیں ایک جگہ لاکر ڈھیر کر دیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں تو جو لوگ اب اپنے تئیں بدنصیب سمجھ رہے ہیں وہ اس تقسیم کو مصیبت اور پہلی مصیبت کو غنیمت سمجھیں گے"۔ بہ الفاظ دیگر اس بات کو آگے چل کر یوں کہا ہے کہ "اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے ہیں۔ تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو اچھا سمجھتا"۔ اس مضمون میں ایک حقیقت یوں بیان فرماتے ہیں۔ کہ "جو مصیبتیں ہم پر پڑتی ہیں وہ حقیقت میں ہمارے سہارے کے بموجب ہوتی ہیں۔ یا یہ بات ہے کہ سہتے سہتے ہمیں ان کی عادت ہو جاتی ہے۔

یہ بات درحقیقت صحیح ہے کہ جب انسان رنج والم سے ہم کنار ہوتا ہے۔ تو اسے غم میں ایک لذت سی محسوس ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ رنج وغم برداشت کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ وہ ہر مصیبت اور تکلیف، رنج وغم کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے لگتا ہے۔ اگر سچ پوچھا جائے تو غم ہی انسانی زندگی کو بہتر سے بہتر بنا سکتا ہے، کیونکہ خوشی اور آرام میں ہم بدمست اور لذت پرست ہو جاتے ہیں۔ اور یہاں تک کہ ہم خدا کو بھی بھول جاتے ہیں۔ انسان رنج وغم میں کچھ کا کچھ کر کے دکھا دیتا ہے اور آخرکار ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ غم راحت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ زندگی کا فلسفہ ہے۔ جو روزمرہ انسان کی عملی زندگی میں دیکھنے میں آتا ہے۔ اس لئے غم کو زندگی کا فلسفہ کہا جاتا ہے۔ غالب نے اس فلسفہ کو یوں بیان کیا ہے ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج ۔۔۔ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

فانی بدایونی غالب سے ایک قدم اور بڑھتے ہیں ؎

غم بھی گذشتنی ہے، خوشی بھی گذشتنی ۔۔۔ کر غم کو اختیار کہ گذرے تو غم نہ ہو

امید پر دنیا قائم ہے، اور اسی واسطے امید وصل پر برسوں گوارا ہو جاتے ہیں۔ اگر

امید نہ ہو۔ تو دنیا کے لوگوں کا زندہ رہنا دوبھر ہو جائے ۔ اور وہ زندگی کو عذاب خیال کرنے لگیں۔ سچ کہا ہے کہ "آسا جیئے نراسا مرے" امید سے ہر مشکل سہہ لی جاتی ہے۔ امید کے دھوکے وصل سے زیادہ لطف انگیز، خوشنما اور ہمت افزا ہوتے ہیں۔ پروفیسر آزاد "گلشن امید کی بہار" میں فرماتے ہیں کہ "امید ایک رفیق ہمدم ہے، کہ ہر حال اور ہر زمانے میں ہمارے دم کے ساتھ رہتا ہی دم بدم دلوں کو بڑھاتا ہے، سینے کو پھیلاتا ہے۔ خیالات کو وسعت دیتا ہے۔ اور نئی نئی کامیابیوں کی ترغیب دیتا ہے"۔

سچا آدمی اپنی بات پر اٹل ہوتا ہے، دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے لیکن وہ اپنی بات پر ثابت قدم رہتا ہے۔ اگرچہ یہ بات بھی درست ہے۔ کہ اس پر ایک مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ ناپائدار مصائب و آلام اس کا امتحان لیتے ہیں آخرکار وہ ان تمام وقتی مشکلوں کو عبور کر جاتا ہے لیکن "بہت کم انسان ایسے ہوں گے جن میں یہ حوصلہ و استقلال ہو کہ راستی کے راستے میں ہر دم ثابت قدم رہتے ہیں"۔

جو چیز مشکل سے ملتی ہے اس کی قیمت بہت زیادہ ہوا کرتی ہے۔ درحقیقت سچائی کا دوسرا نام کامیابی ہے۔ راستی کی طاقت مسلم ہے۔ جھوٹا آدمی اپنی فریب کاری چالاکی، شعبدہ بازی اور نیرنگ سازی سے کچھ عرصہ کے لئے کامیاب تو ہو جاتا ہے لیکن اس کی یہ کامیابی مستقل اور پائدار نہیں ہوتی۔ آخر میں اس کی قلعی کھل جاتی ہے۔ جھوٹے آدمی میں شیخی، بڑا پن، بے حیائی، ہٹ دھرمی، دھوکہ بازی، عیب جوئی، نکتہ چینی اور شبہ کاری پائی جاتی ہیں۔ دنیا کے نظام کا دارومدار سچائی پر ہے۔ سچائی نور ہے اور جھوٹ تاریکی" اگر سچ کا قدم دنیا سے اٹھا تو جہان اندھیرا اور عالم تہ و بالا ہو جائے گا"۔

یہ ایک قدرتی امر ہے کہ صاحب جوہر اور اہل کمال ہمیشہ سے جاہلوں اور نالائقوں کے ہاتھوں تکلیف اٹھاتے آئے ہیں۔ حضرت آزاد اس کو "علوم کی بدنصیبی" میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔" یہ بیہودہ بے کمال اور نکتہ چیں معترض ہیں۔ ہنرمندوں کے ہنر ان کی

آنکھوں میں کھٹکتے ہیں اور خواہ مخواہ عیب لگا کر ان کی تصنیفات کو خراب کرتے ہیں یا حقداروں کا حق بھی کچھ نہ کچھ زور رکھتا ہے مگر نہ اس قدر کہ طوفانِ نوح کا مقابلہ کرے" اس مضمون میں آگے چل کر بتاتے ہیں کہ "حضرت انسان کا قاعدہ ہے کہ جب اپنے اوج پر آتے ہیں تو اصلیت کو بھول جاتے ہیں۔ اچھوں کو گھٹاتے ہیں۔ بُروں کو بڑھاتے ہیں۔ وہ ایسے اپنے کیے کی سزا پاتے ہیں ...... طوفان بے تمیزی میں قدم رکھنے کو جگہ ملے تو بھی گوشہ گیری ہی بہتر ہے۔"

محنت کامیابی کی کنجی ہے۔ محنت ہائے عرق فشاں کا صلہ اور عزم ہائے عظیمہ کا ثواب دنیا کی شہرت اور ناموری کا انعام ہے۔ اس کی بدولت انسان تمام مصیبتوں پر فتح پا کر نیک نامی اور زندگی حاصل کرتا ہے۔ اور کسی نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ کام ہی عبادت اور زندگی ہے دنیا کے لوگوں نے اسی کی بدولت کیسے کیسے عہدے اور ممتاز رتبے پائے ہیں۔ آزاد اپنے مضمون "شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار" میں دو طرح کے امر جیون بتاتے ہیں۔ "بقائے دوام دو طرح کی ہے۔ ایک تو وہی جس طرح روح کی فی الحقیقت بعد مرنے کے رہ جائے گی اس کے لئے فنا نہیں۔ دوسری وہ عالم یادگار کی بقا جس کی بدولت لوگ نام کی عمر سے جیتے ہیں۔ اور شہرت دوام کی عمر پاتے ہیں"

مندرجہ بالا مضامین پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کو زندگی کی اخلاقی قدریں عزیز ہیں۔ انہوں نے اپنے مضامین میں زندگی کے پوشیدہ رازوں کا بڑا لطیف انداز میں انکشاف کیا ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے۔ کہ انہوں نے نثر میں بڑی اچھی شاعری کی ہے۔ ان کا طرزِ ادا بڑا دلچسپ، دل کش اور دل آویز ہے۔ ان کے تخیل کی پرواز بڑی دور دور کی سیر کرتی ہے۔ اور بات بھی یہ ہے کہ جس کے تخیل میں بلند پروازی ہوتی ہے۔ وہ تمثیلی چیزوں پر خوش اسلوبی سے طبع آزمائی کر سکتا ہے۔ ان کے تخیل کی فراوانی نے "نیرنگِ خیال" کو ایسی زندگی بخشی ہے۔ کہ جس نے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا ہے الفاظ کے طوطا مینا بنانے میں انہیں خاص کمال حاصل ہے وہ اپنے طرزِ تحریر میں تخیل کی بدولت چار چاند لگا دیتے ہیں۔ وہ قدم قدم پر تشبیہات اور استعارات استعمال کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے لکھنے کا ڈھنگ فطری ہے۔ ان تمام خوبیوں نے "نیرنگِ خیال" کو نہ صرف ایک تمثیلی کتاب بننے میں مدد دی ہے۔ بلکہ اس کے طرزِ ادا کو بڑا شگفتہ بنا دیا ہے۔ ان کے مضامین کہانیوں سے زیادہ لطف دیتے ہیں۔ انہوں نے زندگی کی بعض سنگین اور ٹھوس چیزوں کو روزمرہ کی باتوں کی طرح پیش کیا ہے۔ اور "نیرنگِ خیال" اس کا من وعن نمونہ ہے۔